تعلیم وتربیت:

دینی مدارس اور عصر جدید

ڈاکٹر سید حامد
چانسلر، جامعہ ہمدرد نئی دہلی

شمالی ہندوستان میں اس وقت تین یونیورسٹیاں ایسی ہیں جنہیں اقلیتوں کے مسائل سلجھانا چاہئے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا تو منشور ہی اسے یہ اختیار دیتا ہے اور اس امر کا پابند کرتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی پیشرفت کے لئے سرگرم عمل ہو۔ جامعہ ہمدرد جو ایک مصور یونیورسٹی ہے، اپنے اقلیتی کردار کے تحت مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی طرف عملی اور بار آور توجہ دے رہی ہے۔ اس نے داخلوں کے لئے دینی مدارس کی اسناد کو خوش دلی اور فراخ مشربی کے ساتھ تسلیم کرلیا ہے۔ اس کے روشن خیال وائس چانسلر نے جامعہ ہمدرد کے فیض کو عام اور بسیط بنانے کے لئے چند عملی تدابیر مرتب کی ہیں، جن کے نتیجے میں دور دراز ریاستوں سے بھی طلبہ داخلے کے لئے جامعہ ہمدرد کا رخ کررہے ہیں۔ انہوں نے غیر سرکاری یا رضاکار انجمنوں سے یاداللہ کی تمہید بھی اٹھائی ہے۔

جامعہ ملیہ ضابطہ کی رو سے اقلیتی ادارہ نہیں ہے لیکن اس کی بنیاد گذاروں کو اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ منجملہ دیگر مقاصد کے اس کی تاسیس کا ایک بڑا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کے تمدن اور ادب کو فروغ دینا ہے۔ یہ بات کبھی کبھی دہرانے کے قابل ہے کہ جب اس بڑے قومی ادارے کا نام رکھا جارہا تھا تو متعلقہ مسلمان اکابر جامعہ ملیہ سے آگے نہیں بڑھ پائے تھے اور وہ اس دو لفظی نام سے مطمئن تھے۔ لیکن گاندھی جی نے مداخلت کرتے ہوئے اصرار کیا کہ اس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھا جائے۔ تصور کیجئے کہ اگر ان کی عمر نے وفا کی ہوتی اور وہ ملک میں دستور سازی پر اثرانداز ہو سکتے تو آئین

بعض مسائل خصوصاً تعلیمی مسائل سے متعلق جانگزا ابہام سے جو سرد مہری کے باعث، اس میں رسوخ کر گیا ہے اور جس کا خمیازہ مسلسل اٹھا رہی ہیں، محفوظ رہتا۔ یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ موضوع زیر بحث کے ضمن میں امر واقعہ یہ ہے کہ یہ تینوں یونیورسٹیاں اپنی فراخ مشربی اور اپنی سیکولر روایات کے لئے مشہور و معروف ہیں۔

اب سے تقریباً تیس پینتیس سال قبل جامعہ ملیہ اسلامیہ نے دینی عالموں اور عصری دانشوروں کے مابین گفتگو اور اتحاد عمل کے لئے ایک مجلس منعقد کی تھی۔ یہ ایک بہت عمدہ پیش قدمی تھی۔ اس نشست کی روداد کو، اگر یہ محفوظ ہو، تو منظر عام پر لانا چاہئے اور یہ جستجو بھی کی جانی چاہئے کہ اس مجلس کی تجاویز پر کیا عمل ہوا؟ ملت دو نیم ہو گئی ہے، اس کے دینی اور عصری اکابر کو یکجا کرنا یقیناً معنی خیز اور نتائج انگیز ہو گا۔ توحید کے نام لیوا دوئی کو آخر کب تک برداشت کریں گے؟۔

جو لوگ دینی مدارس کے معیار تعلیم کو بلند کرنا چاہتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ نصاب میں ترمیم سے بھی زیادہ اہم طریق تدریس میں تبدیلی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دانشمند شیخ الجامعہ نے اس باب میں پہل کی تھی اور ایک پروجیکٹ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو بھیجا بھی تھا کہ مدارس کے اساتذہ کو ایک ورکشاپ کے ذریعہ جدید طریق تدریس سکھایا جائے۔ یو۔جی۔سی نے شاید اس کی اہمیت کو نہیں سمجھا اور پروجیکٹ کو منظور نہیں کیا۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے البتہ ایک دس روزہ سمینار اس مقصد کے حصول کے لئے تعلیم آباد میں ۱۲ دسمبر سے ۱۸ دسمبر ۲۰۰۲ء تک منعقد کیا جس میں طریق تدریس اور تعلیمی اقدار کو موضوع بحث بنایا گیا تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ کا تعاون مذکورہ سوسائٹی کو یقیناً درکار ہو گا۔ لیکن اس چھوٹے سے فرض کفایہ سے کام نہیں چلے گا۔ اچھا ہو کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنے پروجیکٹ کا احیاء اور از سر نو اس کا تعاقب کرے۔

آپ کے سمینار کا پروگرام امید افزا ہے۔ یہ دینی مدارس کے عہد بہ عہد اور ملک بہ ملک ارتقاء کا جائزہ لے گا۔ اس لحاظ سے اس سمینار کی بحثیں جامع و نافع ہوں گی نیز معنی خیز اور راہنما بھی۔ جن موضوعات کا تعین کیا گیا ہے وہ یقیناً قابل تفتیش ہیں۔ ان پر قرار اگر واقعی اور کماحقہ تحقیق کی گئی تو کچھ نتائج ایسے ضرور نکلیں گے جو عمل کے طالب ہوں گے۔ کیا یہ بھی ممکن ہو گا کہ مقالہ نگار اور

مقرر اپنے مقالہ کو اختتام تک پہنچاتے وقت اس امر کی نشان دہی بھی کریں کہ ان سے عمل کے لئے کیا کیا راہیں نکلتی ہیں اور اس کے لئے عملی اقدامات کی تقسیم کس عنوان سے ہونی چاہئے؟ ہندوستانی مسلمان اب اس موڑ پر ہیں جہاں وہ ایک اجتماعی جائزہ لیں۔ سمت سفر اور رخ و روش کو بدلیں۔ نشاۃ ثانیہ کی تیاری کئے بغیر نہ نجات ممکن ہوگی نہ بقا۔ ایسے موڑ پر مدارس کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

سر محفل مجھے یہ اعتراف کر لینے دیجئے کہ مطالعات اسلامی کے شعبوں کی کارگزاری نے اس بے بضاعت انسان کو بالعموم متاثر نہیں کیا ہے۔ عام حالات میں وہ موضوعات جن پر ان شعبوں میں متواتر تحقیق ہو رہی ہے، موزوں سمجھے جاتے لیکن موجودہ حالات میں ہمیں ان موضوعات کو ترجیح دینی چاہئے جن کا ہماری فلاح اور پیشرفت سے براہ راست اور فوری تعلق ہو۔ اس ضمن میں ایک نشست شیوخ جامعات کی دوسرے مبصرین کے ساتھ جامعہ ہمدرد میں ہوئی تھی لیکن مذاکرات باریکیوں اور موشگافیوں میں الجھ کر رہ گئے۔ یہ نامہ سیاہ سمجھتا ہے کہ مطالعات اسلامی کے ضمن میں تینوں یونیورسٹیوں کے مابین ایک زندہ و تابندہ تعاون کی بڑی گنجائش ہے۔ اس کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے کہ تعلیم کے دینی اور عصری اداروں کو ان تینوں یونیورسٹیوں اور دینی جامعات سے منظم طریقے پر رہنمائی ملتی رہے۔ اس کے علاوہ دینی مدارس کو رہنمائی اور مشورے کی بھی ضرورت ہے۔

یہ تینوں یونیورسٹیاں جو ہماری منظورِ نظر ہیں، سر جوڑ کر ایک کام اور بھی کر سکتی ہیں۔ اور وہ کام ہے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینا۔ اور ان بدگمانیوں کو دور کرنا جو مسلمانوں کے متعلق پھیلائی گئی ہیں اور دلوں میں جاگزیں ہو گئی ہیں۔ ہم لوگ جو عامی ہیں اگر ان غلط فہمیوں کے ازالہ کی کوشش کرتے ہیں تو ہماری بات کو وزن نہیں دیا جاتا لیکن اگر یونیورسٹیوں کے شعبہ جات مطالعات اسلامی ان باتوں کو جو بے بنیاد ہیں اور ہمارے متعلق کہی جارہی ہیں، تحقیق اور استدلال سے رد کریں گے تو ان کی بات احترام اور توجہ کے ساتھ سنی جائے گی۔ ایک ایسی ملت کے لئے جو جذبات کی اسیر ہو کر رہ گئی ہے یہ مزید ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کی یونیورسٹیاں فلاحی، اصلاحی، تحقیقی، تردیدی اور ترجمانی کردار ادا کریں۔ جہاں قیادت اور صحافت زیادہ تیز گام اور بلند آہنگ اور زود مشتعل اور عاقبت نااندیش ہو جاتی ہو، وہاں اعتدال اور توازن اور میانہ روی، سنجیدگی، تدبّر، اور دور اندیشی اور عملی تحقیق کی ذمہ داری

یونیورسٹیوں کے فراخ شانوں کی طالب ہوتی ہے۔ میری تجاویز پر یہ کہکر اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ یونیورسٹی کا کیا یہی کام رہ گیا ہے؟ میں یہ کہوں گا کہ یونیورسٹی کے اہم ترین کاموں میں سے چند کام یہ بھی ہیں۔ غلط فہمیوں کو دور کرنے میں تو بھلائی ہی بھلائی ہے۔ اس سے صلح و آشتی کو تقویت ہو گی۔

اعتراض کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کا زیادہ بار ایک ایسے شعبہ پر پڑے گا جس کے لئے یہ موضوعات اجنبی نہیں۔ باقی کام کئی شعبے مل کر کریں گے۔ یوں بھی کئی شعبوں کا باہم مل کر کام کرنا تحقیق کی دنیا میں عام طور پر رائج ہوتا جارہا ہے بلکہ یوں کہوں کہ اس پر زور دیا جارہا ہے۔ چنانچہ یونیورسٹیوں سے اب لوگ یہ توقع کرتے ہیں کہ درون خانہ تعلیم دینے کے علاوہ برونِ در (extra-mural) بھی جائیں یعنی عوام کو بھی ان کے اذہان و وسائل کا فیض پہنچے۔ مسلم عوام کے لئے جو اس وقت بے انکل ہیں اور بے علم ہو کر رہ گئے ہیں، یہ بات اور زیادہ اہم ہے کہ انہیں یونیورسٹیوں سے رہنمائی اور مشورہ اور تعلیمی امداد اور ہدایت ملتی رہے اور ان کے تعلیمی اداروں کی ان کے ذریعہ اصلاح ہوتی رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان تینوں یونیورسٹیوں کے روشن فکر و بیدار مغز وائس چانسلر اپنی اپنی یونیورسٹی کو یہ رخ اور یہ کردار دینے کے لئے تیار ہوں گے۔ کیا اس بنا پر ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ اساتذہ بھی سمت کی اس تبدیلی پر خوشی خوشی راضی ہو جائیں گے۔ سمت کی تبدیلی تکلیف دہ اور صبر آزما تو ہوتی ہے لیکن مقصد کے لئے تکلیف تو اٹھانی ہی پڑتی ہے اور صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔

اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ یہ بات تو عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ دینی اور عصری تعلیمی اداروں کی تقسیم کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ ان مضامین میں ناباہمی مغایرت ہے اور ناہی تضاد۔ ہندوستان میں بظاہر الگ دینی مدارس قائم کرنے کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم پر قدغن لگ گئی۔ ہندوستان میں دینی مدارس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ان کے نصاب میں بعض اہم عصری مضامین کا شامل کرنا بھی ضروری ہے یعنی کون سے مضامین شامل کئے جائیں، دینی اور عصری مضامین کے درمیان وقت کی تقسیم کس طرح ہو؟ مدارس کے نصاب میں جو غیر دینی مضامین شامل ہیں، ان میں سے کن کن کو کم کیا جائے؟ عصری مضامین کے اضافہ کے بعد کیا مدت تعلیم اور کے اوقات میں اضافہ درکار ہو گا؟ کیا ایک یا دو سال

بڑھانے پڑیں گے ؟مرکزی حکومت نے مدارس کو نیا رخ دینے یا انہیں جدید بنانے کی اسکیم کوئی ۸ سال ہوئے رائج کی تھی۔اس کے لئے مختلف ریاستوں کے ذریعہ مدارس کو امداد بھی دی گئی، لیکن اسکیم کے لئے جس تیاری کی ضرورت تھی اس سے وہ محروم رہی۔ایک ریاست میں یہ جائزہ بھی لیا گیا کہ یہ اسکیم عمل میں کس طرح آئی اور اس میں کیا کوتاہیاں پائی گئیں ؟لیکن بات آگے نہیں بڑھی اور ایک ناپختہ پروگرام پر روپیہ صرف ہوتا رہا۔ تجربے سے فائدہ اٹھانے کو کیا اقدام ہوش وگوش نہ کہا جائیگا؟

سرکار نے مدارس کو نیا رخ دینے (modernisation) کا فیصلہ کرنے سے پہلے بعض مدارس کے نمائندوں سے مشورہ کیا تھا،جب انہوں نے اتفاق کیا تب حکومت نے قدم بڑھایا۔لیکن جن اصحاب سے مشورہ کیا گیا وہ مجوزہ اقدام کے مضمرات اور تعلیمی تبدیلی کی پیچیدگیوں سے نا آشنا تھے۔چاہئے تو یہ تھا کہ ماہرین کے ذریعہ سوالنامہ مرتب کیا جاتا اور اس کی تفصیلات پر بحثیں ہوتیں، تب ایک جامع عملی پروگرام بنایا جاتا۔لیکن ایسا نہیں ہوا۔اب کوئی وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ پروگرام اپنے مقاصد کو پورا بھی کر سکا یا نہیں ؟اس وقت کیفیت یہ ہے کہ ہمارے بڑے دارالعلوم عصری مضامین کے شمول پر غالباً راضی نہیں ہیں۔البتہ درمیانی جامعات اور مدارس اسے قبول کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس فکر اور اس مہم میں بڑے مدارس کے منتظم اکابر کی شرکت ناگزیر ہے۔جامعہ ملیہ اسلامیہ اگر مناسب سمجھے تو جو اقدام اس نے تیس پینتیس سال پہلے کیا تھا اس کا دوسرا اقدام اب کر لے۔چاہے تو اپنے ساتھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ہمدرد کو اس عہد آفریں مہم میں شریک کر لے۔میں یہاں خود کو مجبور پا رہا ہوں کہ غالبؔ کا وہ پردہ کشا اور حوصلہ افزا شعر دوہراؤں کہ جس نے آرزو اور کوشش کو حدود ناآشنا تک پہنچا دیا ہے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

ہمیں اس وقت جس بیماری نے لاچار کر رکھا ہے وہ تمنا سے محرومی،اداسی اور بے حسی ہے۔ اداس ہو کر جینا بھی کوئی جینا ہے؟ بے تمنائی اور تنگ آرزومندی ایک منفی کیفیت ہے جو صرف ایک کام کر سکتی ہے یعنی کچھ نہ کرنے کے لئے عذر تلاش کر لینا، مشکلات کی رائی کو پہاڑ بنا لینا اور رکاوٹوں سے خوف کھا کر پسپا ہو جانا۔اس وقت جبکہ مدارس پر حملے کئے جا رہے ہیں ہمیں متحد ہو کر بہ یک وقت

ان کی حفاظت اور اصلاح کی تدبیر کرنی چاہئے، مرجھا کر اور تامل اور تردد کے ساتھ نہیں بلکہ پورے جوش و خروش اور ذوق و شوق کے ساتھ۔ یاد رکھئے:

جس دل میں آرزو نہ ہو مٹی کا ڈھیر ہے　　گرمی لہو کا وصف ہے، سودا ہے سر کے ساتھ

نظری بادیہ پیمائی کی افادیت تسلیم لیکن قوموں اور جماعتوں کی زندگی میں وہ وقت بھی آتا ہے جب آثار و قرائن کو بعینہ قبول کر کے، بغیر کسی مزید تحقیق و تفتیش کے عملی قدم اٹھانے پڑتے ہیں۔ ہم ایسے ہی وقت کے حصار میں خود کو دیکھ رہے ہیں جہاں تاخیر اور موت کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ یہ لمحہ ہے ہمہ جہت سعی و کوشش کا۔ اس کوشش کا پہلا خطاب مدرسہ سے ہوگا۔

اگر وقت اجازت دے تو ہم اپنے طور پر یہ سوچ سکتے ہیں کہ مدارس کے نصاب میں عصری مضامین میں سے کن مضامین کو داخل کیا جائے؟ آیا فزکس، کیمسٹری، بایولوجی اور ریاضی کو یا علوم اجتماعی کو؟ یہ بے بضاعت انسان اب اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اجتماعی علوم انسان کے گرد گھومتے ہیں اور اس کے روابط، رجحانات، میلانات، محرکات اور نیات کا احاطہ کرتے ہیں۔ انہی علوم کے تحت دوسرے ادیان و مذاہب سے واقفیت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ اس بنا پر کہ ریاضی کی کلیدی اہمیت ہے اور وہ ام العلوم۔ ہے اسے تو بہر حال شامل نصاب ہونا ہی چاہئے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک اور بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے۔ عصری مضامین کے سلسلے میں رد و قبول اور انتخاب کا اختیار طالب علم کو ہوگا۔ وہ عصری مضامین پڑھے یا نہ پڑھے اور اگر پڑھے تو کون سے؟ یہ فیصلہ کرنے کی مقدرت ہر طالب علم کو ہوگی۔ جدید طریق تدریس کا سیکھنا البتہ ہر طالب علم پر لازم ہوگا۔ یہ آرزو تو بہت سے دلوں میں ہوگی کہ دینی مدارس اور جامعات کے طلبہ تعلیم کی تکمیل کے بعد، مدارس و مساجد کو ضروری افرادی طاقت تو فراہم ہی کریں لیکن ساتھ ہی روزگار اور معاملات اور صنعت و تجارت میں حسب استطاعت ضرور شریک ہوں تاکہ نکتہ چیں لوگ ایک طرف یہ محسوس کریں کہ وہ معاشرے کے کار آمد اور تخلیق کار فرد ہیں، دوسرے یہ کہ ان کے اخلاق و اطوار، نظم و ضبط اور شائستگی کا ان کے ہمسایوں اور رفقائے کار پر صحتمند اثر پڑ رہا ہے۔

مدارس پر سیمینار یہ تحقیق کرنے نکلا ہے کہ مختلف ادوار اور مختلف اقالیم میں مدارس کے

نصاب کن تبدیلیوں سے گزرے ہیں؟ کیا وہ یہ تلاش کرنے کی کوشش بھی کرے گا کہ ان تبدیلیوں کے محرکات کیا تھے اور پھر ان کے اثرات کیسے مرتب ہوئے؟ یعنی قوموں کے عروج وزوال کا ان کی تعلیم کے نظام و نصاب پر کیا اثر پڑا ہے؟ نصاب کا تجزیہ اور اس کی تفتیش کرنیوالوں کو سمندر سے یہ موتی ضرور نکالنا ہوگا کہ عہد بہ عہد، اقلیم بہ اقلیم، مدارس کے نصاب کے اجزائے ترکیبی میں کیا کیا تبدیلیاں کن محرکات کے تحت وقوع پذیر ہوئیں اور ان کے واقع ہونے کے بعد کیا اثرات رخ اور روش پر مرتب ہوئے؟ ضمناً یہ بات بھی تلاش کرنے کے قابل ہوگی کہ مدارس کے نصاب میں فارسی کا کیا حصہ رہا ہے، اور فی الوقت دینی مآخذ اور ادب تک ہماری رسائی کے لئے فارسی کی اہمیت کس قدر ہے؟ پھر خیال آتا ہے کہ شاید سب کچھ اس سمینار میں جو ماضی کا احاطہ کر رہا ہے، ممکن نہ ہوگا۔ کیا یہ ممکن ہوگا کہ مدارس کے منتظم اراکین اہتمام سے گفتگو کے بعد آئندہ سال اس برگزیدہ سمینار کی ایک دوسری نشست کا اہتمام کریں جو مستقبل میں مدارس کے نصاب پر غور و فکر کرے۔

ذرا سی دیر کے لئے رُکئے اور غور کیجئے کہ یہ جو اصرار ہم متواتر کر رہے ہیں کہ جدید مضامین کو نصاب میں شامل کیا جائے، کیا یہ منصفانہ اقدام ہے؟ کیا ان لوگوں کو جنہوں نے جدید تعلیم حاصل کی ہے، یہ حق حاصل ہے کہ مدارس کے نصاب پر عام اور عامیانہ طریقے سے اثرانداز ہوں؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حق انہیں صرف ایک صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ جب وہ جدید تعلیمی نظام کے تربیت یافتہ لوگوں اور زیر تربیت طالب علموں کی بھی اسی طرح نگرانی کریں جیسے وہ مدارس کے طلبہ اور فارغ التحصیل شاگردوں کی کر رہے ہیں، یعنی اس بات پر مسلسل اور پرزور اصرار کریں کہ عصری تعلیم حاصل کرنے والے دین کی بنیادی تعلیم ضرور حاصل کریں۔ حالات بتا رہے ہیں کہ سوائے ان معدودے چند اسکولوں کے جو مسلمانوں کے زیر انتظام ہیں، عام عصری اسکولوں میں دین کی تعلیم حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے گھر گھر میں دینی تعلیم کا انتظام ہونا چاہئے۔ کیا ہم اپنی اس پوری نسل کے جو عصری اسکولوں میں تعلیم پا رہی ہے، دین سے بیگانہ اور بے تعلق پرورش پانے پر مطمئن ہیں۔ اگر نہیں تو اس کا مداوا کیوں نہیں کرتے؟ جتنا اصرار ہمیں دینی طلبہ کے لئے اہم عصری مضامین سے بہرہ ور ہونے پر ہے اس سے بھی زیادہ اہمیت ہمیں عصری طلبہ کو دینی واقفیت بہم پہنچانے پر ہونا چاہئے۔ اگر ہم نے موخر

الذکر کو ان کی روش اور صوابدید پر چھوڑ دیا تو دین سے ان کا رشتہ عبرتناک طریقے سے ٹوٹ جائے گا۔ عصری طلبہ کو دینی تعلیم گھر پر دینی ہوگی۔ اگر انھیں یہ تعلیم گھر پر نہ دیگی تو پھر وقت نہیں ملے گا۔ یہ کام بہت بڑا ہے لہٰذا اس کے لئے بڑے جتن بڑے پیمانے پر ہی کرنے پڑیں گے۔ سب سے پہلا قدم یہ ہوگا کہ بنیادی دینی کتابیں گھر گھر پہنچائی جائیں۔ اس مہم کو سر کرنے کے لئے ذہنی اور مالی یعنی دونوں قسم کے وسائل درکار ہوں گے۔ مقصد کو وضاحت کے ساتھ سامنے رکھ لیا جائے پھر جو کچھ جس کے بس میں ہو وہ کرے۔ ڈاکٹر عابد اللہ غازی نے بنیاد اقراء شکاگو کے توسط سے انگریزی میں مذہب سے متعلق بہت اچھی کتابیں شائع کی ہیں۔ یہ سہل بھی ہیں، دیدہ زیب اور معنی خیز بھی۔ اس بنیاد کی ہمزاد ممبئی میں بھی قائم ہوئی ہے۔ یہ احتیاط بھی واجب ہے کہ اس اچھے اور ناگزیر کام میں مسالک کے اختلافات مانع نہ ہونے پائیں۔ فروعی اختلافات کو سدِ راہ کیوں ہونے دیں؟ نفاق انگیزی کا خاتمہ کیجئے کیونکہ اس کی بنا پر ہم جابجا ہدف تضحیک بن رہے ہیں۔ یہی نہیں، اس بنا پر ہماری طاقت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئی ہے۔ خود کشی پر کمر آخر ہم نے کس لئے باندھ لی ہے؟ اگر ہم نے نفاق کو شیوہ بنالیا تو ہم کیسے پنپ سکیں گے؟ اتنی موٹی سی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ خطائیں اپنی اور اپنی شکایتیں دوسروں سے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ کمر کس کر رزمگاہ حیات میں اتحاد اور اعتماد کے ساتھ اتر جایئے۔ کیا ستم ہے کہ آپ نہ کمر کسیں گے، نہ متحد ہوں گے اور امید رکھیں گے کہ زوال کے گرداب سے نکل جائیں۔ گرداب نہ ہوا نجات دہندہ ہوگیا۔

مذاکرات میں تحقیق اس بات کی بھی کی جائے کہ ماضی میں مدارس کے نصاب کو مسالک کے اختلافات سے کس طرح محفوظ رکھا گیا تھا؟

مسائل کا مد عا لے کر اٹھیں بھی تو تان بالآخر وسائل پر ہی آکر ٹوٹے گی، افرادی اور مالی وسائل۔ ابتدا مالی وسائل سے کی جائے تو صارفیت کے اس دور میں افرادی وسائل کی دستیابی آسان ہو جائے گی۔ لیکن یہ کام کرنے کون اٹھے؟ خصوصاً ایسی ملت میں جو زخم خوردہ ہے اور بدگمان ہے اور جو آغاز ہی شک و شبہ سے کرتی ہے اور جس میں چندہ کرنے والے، حساب رکھنے اور حساب دینے سے گریز کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو اگر زندہ رہنا ہے اور عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہے تو اللہ کے

بندوں کو قریہ قریہ سے اس کام کو پورا کرنے کے لئے اٹھنا ہوگا! اُنہیں تحریک، تربیت اور تعلیم ان یونیورسٹیوں سے ہی ملے گی جو حالات حاضرہ سے اثر پذیر ہونے کے باوجود ہماری آنکھوں کا تارہ ہیں۔ اساتذہ کو، طلبہ کو، اہل درد اور اہل شعور کو گھروں پر دستک دینی ہوگی۔ دنیا اور آخرت دونوں کا واسطہ دے کر والدین سے استدعا کیجئے کہ اپنے بچوں کو دین، اخلاق، اقدار اور راست روی کی تعلیم اس طرح دیں یا دلوائیں کہ یہ سب کچھ رگ وجاں میں پیوست ہو جائے۔

ایک اعداد شناس مبصر نے حال ہی میں یہ تخمینہ لگایا ہے کہ ہمارا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستان بھر میں یونیورسٹی جانے والے مسلم طلبہ کے صرف ۳ فیصد افراد کو تعلیم دے رہا ہے، اس میزان پر جامعہ ملیہ کا شمار اعشاریہ میں چلا جائے گا اور جامعہ ہمدرد اس سے بھی نیچے۔ ان اعداد و تناسب کی روشنی میں غور کیجئے کہ مذکورہ یونیورسٹیوں کو مسلمان اہمیت کیوں دے رہے ہیں؟ ان کی قسم کیوں کھا رہے ہیں؟ ابتدا اس عقیدت اور وابستگی کی سید والا گہر کی عہد آفریں تحریک سے ہوئی تھی۔ لیکن اب جبکہ یونیورسٹیوں کی فراوانی دیکھنے میں آرہی ہے ہماری یہ تینوں یونیورسٹیاں اپنے مرکزی وجود کا جواز اور مسلمانوں کی توقعات کی تشفی کا سروسامان صرف اس طرح فراہم کر سکتی ہیں کہ وہ مسلمانوں کے مسائل کو زیر تحقیق لائیں، اعداد و شمار جمع کرنے کے بعد ان کا تجزیہ کریں اور ان سے تعمیر و ترقی اور راہبری و ہدایت کی راہیں نکالیں اور ملک بھر میں بکھرے ہوئے مسلم تعلیمی اداروں، اسکولوں اور مدرسوں کو اعلیٰ معیار کی راہ پر گامزن کرائیں۔ مسلمانوں کے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ کریں تاکہ وہ اپنے عالی معیار تدریس و تحقیق اور کسبِ فضیلت سے دنیا میں پہچانے جائیں۔

☆☆☆☆☆☆